

علوم آسمانی اور اسرار قرآنی کی واقفیت کے لئے تقویٰ پہلی شرط ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ بے ایمان، شریر، خبیث النفس، ارضی خواہشوں کے اسیران سے بہرہ ور ہوں۔

اہل لغت اور مفسرین کے حوالہ سے لفظ ”الحکیم“ کے مختلف معانی کا بیان اور اللہ تعالیٰ کی صفت حکیم کی پُر حکمت تشریحات۔

آج اگر کسی حَکَم نے فیصلہ کرنا ہے اور ہمیشہ سے جو حَکَم فیصلہ کرتا آیا ہے وہ خدا تعالیٰ کی ذات ہے اور وہی سب سے بڑا حَکَم ہے، منصف ہے، سچ ہے جس نے فیصلے کئے ہیں اور ان کے فیصلوں کے مطابق ہم اسی دین پر قائم ہیں جو محمد مصطفیٰ ﷺ لے کر آئے تھے اور انشاء اللہ مرتے دم تک قائم رہیں گے۔

خطبہ جمعہ سیدنا امیر المومنین حضرت مرزا مسرور احمد خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز
فرمودہ مورخہ 07 دسمبر 2007ء بمطابق 07 رجب 1386 ہجری شمسی
بمقام مسجد بیت الفتوح، لندن (برطانیہ)

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ
أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ - بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ - الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ - مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ -
إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ - صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ -

گزشتہ چند خطبوں سے صفت عزیز کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مختلف آیات میں جو مختلف مضامین بیان کئے ہیں ان کا ذکر کر رہا تھا۔ جیسا کہ میں نے صفت عزیز کے مضمون کے شروع میں بتایا تھا

کہ اللہ تعالیٰ نے صفت عَزِيزَ کا جہاں بیان فرمایا ہے ان آیات میں تقریباً نصف جگہ پر عَزِيزَ اور حَكِيمَ کو ملا کر بیان کیا ہے۔ تو آج میں صفت حَكِيمَ کا بیان کروں گا۔ گو کہ صفت عَزِيزَ کے ساتھ آیات کی وضاحت میں صفت حَكِيمَ کا بھی کچھ بیان ہو چکا ہے لیکن اس لفظ حَكِيمَ کے لغوی معنی اور ان معنوں کے اللہ تعالیٰ کی ذات کے تعلق میں، یعنی لفظ حَكِيمَ جب خدا تعالیٰ کی ذات کے بارے میں بولا جاتا ہے، جب اس کی صفت کا بیان ہوتا ہے، تو اس کے حقیقی معنی کیا ہیں، پہلے اس کا بیان صحیح طریقے سے نہیں ہو سکا، وہ میں آج مختلف لغات اور تفسیروں سے بیان کروں گا۔

لسانُ العرب میں لکھا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اَلْحَكِيمُ حکمت والے کو کہتے ہیں۔ عربی کے الفاظ یہ ہیں کہ قِيلَ اَلْحَكِيمُ ذُو الْحِكْمَةِ یعنی حکمت والے کو حکیم کہتے ہیں اور اَلْحِكْمَةُ سے مراد یہ ہے کہ افضل ترین اشیاء پر، افضل علوم کے ذریعہ اطلاع پانا۔ اور اس کو بھی اَلْحَكِيمُ کہتے ہیں جو مختلف امور کے اسرار و رموز کو مد نظر رکھ کر انہیں عمدگی اور مہارت سے بجالائے۔ یعنی افضل ترین اشیاء بہترین اشیاء، مثلاً پیدائش کے لحاظ سے، خصوصیات کے لحاظ سے، بناوٹ کے لحاظ سے، مقام کے لحاظ سے، مرتبہ کے لحاظ سے، علم کے لحاظ سے، غرض ہر لحاظ سے جو بہترین چیزیں ہیں ان کا کامل علم اور مکمل طور پر احاطہ کرنا۔ یہ حکمت سے مراد ہے۔ اور پھر ان کی گہرائی تک علم حاصل کرنا اور اَوَّالِ الْحَكِيمِ عالم اور صاحب حکمت کو بھی اَلْحَكِيمُ کہتے ہیں۔ پھر لکھا ہے کہ حدیث میں قرآن کریم کی صفت اس طرح بیان ہوئی ہے کہ وَهُوَ الَّذِي كَرَّمَ الْحَكِيمِ یعنی یہ قرآن تمہارے لئے حاکم ہے اور تم پر حاکم ہے یا یہ ایسی محکم کتاب ہے جس میں کوئی اختلاف اور اضطراب نہیں۔ صاف احکام ہیں، کوئی ابہام نہیں، جن سے کسی قسم کے نقصان کا احتمال کرتے ہوئے انسان ڈرے۔ لیکن اس کے سمجھنے کے لئے تقویٰ شرط ہے۔ صاف دل ہونا شرط ہے۔ اس محکم کتاب کو، جو خدائے حکیم کی طرف سے نازل ہوئی، سمجھنے کے لئے اپنی استعدادوں کے مطابق حکیم ہونا ضروری ہے تب ہی اس کے محکم ہونے کی سمجھ آئے گی۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے ایک جگہ فرمایا ہے کہ:

”علوم ظاہری اور علوم قرآنی کے حصول کے درمیان ایک عظیم الشان فرق ہے۔ دنیوی اور رسمی علوم کے حاصل کرنے کے واسطے تقویٰ شرط نہیں ہے۔ صرف ونحو، طبعی، فلسفہ، ہیئت و طبابت پڑھنے کے واسطے یہ ضروری امر نہیں ہے کہ وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند ہو اور امر الہی اور نواہی کو ہر وقت مد نظر رکھتا ہو، اپنے ہر قول و فعل کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی حکومت کے نیچے رکھے۔ بلکہ بسا اوقات عموماً دیکھا گیا ہے کہ دنیوی علوم کے ماہر اور طلبگار دہریہ منش

ہو کر ہر قسم کے فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں۔ آج دنیا کے سامنے ایک زبردست تجربہ موجود ہے۔“

فرماتے ہیں کہ ”یورپ اور امریکہ باوجودیکہ وہ لوگ ارضی علوم میں بڑی بڑی ترقیاں کر رہے ہیں۔“ دنیاوی علوم میں بڑی بڑی ترقیاں کر رہے ہیں۔“ اور آئے دن نئی ایجادات کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی روحانی اور اخلاقی حالت بہت ہی قابل شرم ہے۔ لندن کے پارکوں اور پیرس کے ہوٹلوں کے حالات جو کچھ شائع ہوئے ہیں ہم تو ان کا ذکر بھی نہیں کر سکتے۔ مگر علوم آسمانی اور اسرار قرآنی کی واقفیت کے لئے تقویٰ پہلی شرط ہے۔ اس میں توبۃ النصوح کی ضرورت ہے۔ جب تک انسان پوری فروتنی اور انکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کو نہ اٹھا لے اور اس کے جلال اور جبروت سے لرزاں ہو کر نیاز مندی کے ساتھ رجوع نہ کرے قرآنی علوم کا دروازہ نہیں کھل سکتا اور روح کے ان خواص اور قویٰ کی پرورش کا سامان اس کو قرآن شریف سے نہیں مل سکتا جس کو پا کر روح میں ایک لذت اور تسلی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن شریف اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اس کے علوم خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ پس اس کے لئے تقویٰ بطور زربان کے ہے، یعنی ایک سیڑھی کے طور پر ہے۔ ایک اوپر لے جانے والا جو کوئی ذریعہ ہے، اس طور پر تقویٰ ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے تقویٰ ایک انتہائی ضروری چیز ہے۔

فرماتے ہیں کہ ”پھر کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ بے ایمان، شریر، خبیث النفس، ارضی خواہشوں کے اسیر، ان سے بہرہ ور ہوں۔ اس واسطے اگر ایک مسلمان، مسلمان کہلا کر خواہ وہ صرف ونحو، معانی و بدلیج وغیرہ علوم کا کتنا ہی بڑا فاضل کیوں نہ ہو، دنیا کی نظر میں شیخ الکل فی الکل بنا بیٹھا ہو لیکن اگر تزکیہ نفس نہیں کرتا تو قرآن شریف کے علوم سے اس کو حصہ نہیں دیا جاتا۔“

فرماتے ہیں ”میں دیکھتا ہوں کہ اس وقت دنیا کی توجہ ارضی علوم کی طرف بہت جھکی ہوئی ہے اور مغربی روشنی نے تمام عالم کو اپنی نئی ایجادوں اور صنعتوں سے حیران کر رکھا ہے۔ مسلمانوں نے بھی اگر اپنی فلاح اور بہتری کی کوئی راہ سوچی تو بد قسمتی سے یہ سوچی ہے کہ وہ مغرب کے رہنے والوں کو اپنا امام بنا لیں اور یورپ کی تقلید پر فخر کریں۔ یہ تو نئی روشنی کے مسلمانوں کا حال ہے۔ جو لوگ پرانے فیشن کے مسلمان کہلاتے ہیں اور اپنے آپ کو حامی دین متین سمجھتے ہیں، ان کی ساری عمر کی تحصیل کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ صرف ونحو کے جھگڑوں اور الجھیڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور ضالین کے تلفظ پر مر مٹے ہیں۔“ کہ ضالین کس طرح کہنا ہے۔ ”قرآن شریف کی طرف بالکل توجہ ہی نہیں اور ہو کیونکر جبکہ وہ تزکیہ نفس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔“

تو آپ نے فرمایا کہ جو نئی روشنی کے چاہنے والے ہیں وہ بھی تقویٰ سے عاری ہیں اور جو اپنے آپ کو عالم سمجھتے ہیں وہ بھی تقویٰ سے عاری ہیں اور جب تک تقویٰ نہ ہو قرآنی علوم حاصل نہیں ہوتے۔

پھر اس کے معنی کے لحاظ سے میں آگے چلتا ہوں۔ مفردات امام راغب میں لکھا ہے کہ حکمت کا مطلب علم اور عقل کی مدد سے حق بات تک پہنچ جانا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے صاحب حکمت ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کی اشیاء کے بارہ میں معرفت اور ان کو غایت درجہ تک تکمیل اور عمدگی کا حامل بنا کر وجود میں لانا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی کسی بھی چیز اور اس کی تکمیل کے بارے میں جو معرفت ہے اس کو عمدگی کا حامل بنا کر وجود میں لانا، کوئی اس میں نقص نہ رہنے دینا۔ اور انسان کے صاحب حکمت ہونے سے مراد ہے، ان وجود میں لائی گئی اشیاء کی معرفت حاصل کر لینا اور بھلائی کے کام کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی پیدائش کے بارے میں معرفت حاصل کرنا، علم حاصل کرنا۔ تو دنیاوی علم حاصل کرنا بھی جو کہلاتا ہے وہ منع نہیں ہے۔ قرآن کریم میں اس کی طرف رہنمائی بھی فرمائی گئی ہے۔ لیکن تقویٰ سے عاری ہو کر صرف اسی کو سب کچھ سمجھنا اور دین کا خانہ خالی رکھنا، یہ چیز حکمت سے عاری ہے۔

پھر کہتے ہیں کہ جب اللہ کے بارہ میں کہا جائے کہ وہ حکیم ہے تو اس سے وہ معانی مراد نہیں ہوتے جو معانی کسی انسان کو حکیم کہنے سے ہوتے ہیں۔ اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَكَمِيْنَ (التين: 09) کہ اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم ہے، یہ بھی اسی لفظ سے نکلا ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مختلف لغات کے حوالے سے حکمت اور حکیم کے مختلف معنی بیان فرمائے ہیں۔ اَلْحَكِيمُ کا ایک معنی عالم کا ہے۔ پھر ایک معنی صَاحِبُ الْحِكْمَةِ کے ہیں (حکمت والا)۔ ایک معنی تمام کاموں کو اچھی طرح کرنے والا۔ جس کے کاموں کو کوئی بگاڑ نہ سکے۔ اور حکمت کے معنی ہیں، عدل، علم، حلم یعنی دانائی۔ پھر ایک معنی ہیں ہر وہ بات جو جہالت سے روکے، ہر وہ کلام جو سچائی کے موافق ہو۔ بعض کے نزدیک اس کے معانی وَضَعُ الشَّيْءِ فِي مَوْضِعِهِ کے ہیں۔ یعنی ہر امر کو اس کے مناسب حال طور پر استعمال کرنا۔ نیز اس کے ایک معنی صَوَابُ الْأَمْرِ وَسِدَادُهُ۔ بات کی حقیقت اور اس کا مغز۔ حکم جو حکیم کا مادہ ہے، اس کے معانی ہیں۔ اصلاح کی خاطر کسی کو کام سے روکنا اور اسی وجہ سے جانور کی لگام کو حَكْمَةٌ کہتے ہیں۔

تفسیر کی کتاب روح المعانی میں آیت قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (البقرة: 33) کی علامہ محمود آلوسی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں فرشتوں نے علم کو بکمالہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا اور پھر اس کے بعد اس کی صفت حکیم کا اقرار کیا کیونکہ ان پر حقیقت کھل گئی تھی۔

یہ آگے پھر تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں، الْحِكْمَةَ کے معانی ہیں: روکنا۔ اسی سے سواری کے منہ میں ڈالی جانے والی لگام کو الْحِكْمَةَ کہتے ہیں، کیونکہ وہ اسے کچی سے روکتی ہے۔ نیز علم کو بھی حکمت کہتے ہیں کیونکہ یہ طریق اس کام میں بگاڑ پیدا ہونے میں روک بنتا ہے اور حکیم کے معانی ہیں ذُو الْحِكْمَةِ: یعنی حکمت والا اور بعض نے حکیم کے معانی یہ کئے ہیں کہ وہ جو اپنی تمام مخلوقات کو محکم طور پر بنانے والا ہے۔

حضرت مصلح موعودؑ نے اس کی تفسیر کی ہے جس کو میں اختصار سے یہاں بیان کرتا ہوں۔ اس آیت کو سمجھنے کے لئے گزشتہ آیات کو بھی دیکھنا ہوگا۔ یہ جو آیت تھی لَا عَلِمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (البقرة: 33)، اس سے پہلی آیات ہیں۔ وَاذْ قَالِ رَبُّكَ لِمَلَكِكَ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً - قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ - قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (البقرة: 31) یعنی اور یاد رکھ جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ یقیناً میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انہوں نے کہا کیا تو اس میں وہ بنائے گا جو اس میں فساد کرے اور خون بہائے۔ جبکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ اس نے کہا یقیناً میں وہ سب کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ پھر اگلی آیت میں آتا ہے کہ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (البقرة: 32) اور اس نے آدم کو تمام نام سکھائے۔ پھر ان مخلوقات کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ مجھے ان کے نام بتلاؤ اگر تم سچے ہو۔ اس پر فرشتوں نے کہا کہ قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا - إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (البقرة: 33) انہوں نے کہا کہ پاک ہے تو ہمیں کسی بات کا کچھ علم نہیں سوائے اس کے جس کا تو ہمیں علم دے۔ یقیناً تو ہی ہے جو دائمی علم رکھنے والا اور بہت حکمت والا ہے۔

جیسا کہ ہم الْحَكِيم کے لغوی معنی میں دیکھ آئے ہیں کہ اس کے معنی حکمت والا اور تمام کاموں کو اچھی طرح کرنے والا ہیں یعنی جسے کوئی بگاڑ نہ سکے۔ پھر اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ بات کی حقیقت اور اس کے مغز تک پہنچنا۔ یہ تمام معنی اَقْرَب نے کئے ہیں۔ بہر حال یہ آیت اور اس سے پہلے کی جو آیات ہیں، جو میں نے ابھی پڑھ کر سنائیں، ترجمہ ہم نے سن لیا ان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کیا معاملہ درپیش تھا۔ اس پر فرشتوں نے کہا کہ ہمیں جتنا تو نے سکھایا ہے اتنا ہی ہمیں علم ہے۔ پہلے انہوں نے کہا آدم کو کیوں پیدا کرنے لگا ہے؟ فساد پیدا کرنے کے لئے؟ جب اللہ تعالیٰ نے سب کچھ معاملہ سامنے رکھا تو اس پر ان کا جواب تھا، ہمیں تو وہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھایا۔ ہم اس بات کا بہر حال احاطہ نہیں کر سکتے جو تیرے علم میں ہے کیونکہ تو تو الْعَلِيم بھی ہے اور الْحَكِيم

بھی۔ یعنی تو بہت جاننے والا اور بہت زیادہ حکمت والا ہے۔ ہم نے تو ظاہری امور کو مد نظر رکھ کر یہ کہہ دیا تھا کہ آدم کی وجہ سے خونریزی اور فساد پیدا ہوگا اور فرشتوں نے بھی جو یہ کہا تھا اپنے علم کے مطابق غلط نہیں کہا تھا۔ آج دیکھ لیں دنیا میں فساد اور خونریزی بھی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ دنیا اس سے بھری پڑی ہے تو اس کا نعوذ باللہ یہ مطلب بھی نہیں کہ فرشتوں کا علم خدا تعالیٰ سے زیادہ تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ بتایا کہ میں جو خلیفہ بنانے لگا ہوں، یہ وجہ فساد نہیں ہوں گے اور فرشتوں نے فوراً سمجھ لیا۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ اے اللہ تو یقیناً علیم اور حکیم ہے، ہم اب سمجھ گئے ہیں کہ ابن آدم جو خونریزی کریں گے، جو فساد ہوگا اس کی ذمہ داری آدم پر نہیں ہوگی بلکہ اس کی وجہ بیرونی دشمنی یا اندرونی کمزوری ہوگی۔ وہ وجود ہوں گے جو اندرونی طور پر کمزور ہوں گے۔ تو اللہ تعالیٰ کے خلیفہ نے تو نیکیوں اور اعمال صالحہ کی تلقین کی لیکن بیرونی دشمنوں نے اس وجہ سے فساد پھیلایا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے اور اندرونی طور پر بعض نے عمل نہ کیا جس کی وجہ سے کمزوریاں بڑھتی گئیں اور فساد پھیلتا گیا۔ تمام انبیاء کی امتوں کو بعد میں ایسے ہی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ بتایا اور فرشتے اس بات کو سمجھ گئے کہ آدم کی خلافت کے نتیجے میں خونریزی اور فساد تو ہو سکتے ہیں اور ہوں گے لیکن ایسے وجودوں کا ظہور بھی ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی متعدد صفات کے حامل ہوں گے اور خدا تعالیٰ کے مظہر ہوں گے۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس کے مطابق آدم کو صفات الہیہ کی تعلیم دی اور آدم نے اس پر عمل کر کے بتا دیا کہ صفات الہیہ کا کامل ظہور بغیر ایسے معبود کے جس میں خیر اور شر کی طاقتیں رکھی ہوں نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ دونوں میں سے ایک کو اختیار کرے اور خیر کی طاقتوں کو محبت الہی کے جذبے سے سرشار ہو کر خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اختیار کرے۔ فرشتوں میں تو یہ طاقتیں نہیں ہیں انہوں نے تو وہی کرنا ہے جس کا حکم ہے۔ اس لئے کسی شاعر نے کہا ہے۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

پس جیسا کہ پہلے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک اقتباس میں بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم کو سمجھنے کے لئے خیر اور تقویٰ شرط ہے اور جب یہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی صفات بھی انسان اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ صفات حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے اندر پیدا کیں اور انسان کامل کہلائے۔ پس فرشتوں نے آدم کی پیدائش پر بھی یہ اقرار کیا اور ہرنبی کی پیدائش پر بھی یہ اقرار کرتے ہیں کہ ان کا علم محدود ہے اور انسان کا ان کے مقابل پر علم لامحدود ہے اور اس بات سے انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ اللہ تعالیٰ

متصور نہ ہو، کوئی تصور نہ کر سکے اور وہ علم اس چیز کے حالات سے، جس کے متعلق وہ علم ہے، ایسی کامل مطابقت رکھتا ہے کہ اس میں ذرہ بھر بھی اخفاء یا شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، کوئی مشتبہ نہیں اور یہ وصف صرف اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے۔ ہاں بسا اوقات ایسے شخص کو بھی حَکِیْم کہا جاتا ہے جو کسی چیز کی صنعتکاری کی باریک در باریک تفصیلات کا علم رکھتا ہو اور اس چیز کو کمال عمدگی سے بناتا ہو۔ اور اس پہلو سے بھی تمام کمال صرف اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے کیونکہ وہی حکیم مطلق ہے۔ اور جو شخص تمام اشیاء کی معرفت رکھتا ہو مگر اللہ کا عرفان نہ رکھتا ہو وہ حَکِیْم کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسے عظیم اور بزرگ ترین چیز یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں جیسا کہ حضرت مسیح موعود عليه السلام نے فرمایا تھا کہ دنیاوی چیزوں میں ترقی بھی بڑی کر لی لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کا راستہ بند ہے اس لحاظ سے وہ حکمت سے عاری ہیں۔ باوجود تمام دنیاوی ترقیوں کے اس تعریف کی رو سے ان کو حَکِیْم نہیں کہا جاسکتا۔

پھر کہتے ہیں کہ ”حکمت تمام علوم میں سے سب سے زیادہ شرف رکھنے والا علم ہے اور کسی علم کی جلالتِ شان معلوم (یعنی جس چیز کا علم حاصل کیا جائے اس کی شان، بزرگی اس کا جلال ہے) کی جلالتِ شان کے مطابق ہوتی ہے“۔ کسی علم کی جو بڑائی ہے، اس کی جو شان ہے وہ جس کے بارے میں علم حاصل کیا جائے اس کی شان کے مطابق ہوتی ہے۔ ”اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر تو کوئی صاحب شرف نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جو شخص اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کر لے وہ حَکِیْم ہے اگرچہ دیگر رسمی علوم میں وہ کمزور ہی ہو۔ اس کی زبان بہت روانی سے نہ چلتی ہو۔ اس کا بیان بظاہر بہت زور دار نہ بھی ہو۔ ہاں بندے کی حکمت کی اللہ تعالیٰ کی حکمت سے نسبت ایسی ہی ہے جیسے بندے کو حاصل اللہ کی معرفت کی، خود اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات کی معرفت سے نسبت ہے“۔ یعنی حکمت کا بھی وہی معیار ہے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بڑی وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات کے بارے میں جو معرفت ہے، جو علم ہے اُتنا بندے کو تو نہیں ہو سکتا۔ پس جتنا بندے کا معیار اس علم کے حاصل کرنے کے بارے میں ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ہے۔ اور جو علم اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات کے بارے میں ہے ان کے درمیان جو فرق ہے وہی انسان کی اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کے درمیان فرق ہے۔

آگے پھر کہتے ہیں کہ ”لیکن اگرچہ بندے کی حاصل حکمت کو اللہ کی حکمت سے بہت دُور کی نسبت ہے لیکن پھر بھی یہ بندے کو حاصل ہونے والی حکمت تمام معرفتوں میں سے نفیس ترین اور اپنی خوبی کے اعتبار سے کثیر ترین ہے اور جسے حکمت عطا کر دی جائے تو یقیناً اسے خیر کثیر عطا کر دی گئی اور نصیحت تو صرف عقلمند ہی حاصل

کرتے ہیں۔“ یہ ایک آیت کی تشریح ہے جو میں نے پڑھی۔

پھر کہتے ہیں کہ ”ہاں یہ بات درست ہے کہ جسے پھر اللہ کی معرفت حاصل ہو جائے اس کا کلام اس کے غیر سے مختلف ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا شخص چیزوں کی جزئیات میں کم ہی جاتا ہے بلکہ اس کا کلام اجمالی ہوتا ہے نیز وہ عارضی اور دنیاوی مصالِح کی بجائے اُن امور کی طرف توجہ کرتا ہے جو عاقبت میں نفع بخش ہوتے ہیں اور جبکہ اس کے کلمات کلیۃً اللہ تعالیٰ کی معرفت کے طفیل لوگوں کے نزدیک بھی واضح ترین ہوتے ہیں اس لئے بسا اوقات لوگ اس کے کلام کے لئے حکمت کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس قسم کا کلام کرنے والے شخص کے لئے حَکِیْم کا لفظ بولتے ہیں اور یہ ویسا ہی مضمون ہے جیسا کہ حضرت سید الانبیاء ﷺ کا ارشاد پاک ہے کہ رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللَّهِ یعنی اللہ کا خوف ہی اصل حکمت ہے۔ تقویٰ ہی اصل حکمت ہے۔“

حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک حَکِیْم وہ ہے جو مجرموں کا مواخذہ کرتے ہوئے حکمت کے تقاضوں کو ترک نہیں کرتا۔ اس کی تشریح کر رہے ہیں کہ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَ تَكْوِيْنُ السِّيْنَةِ فَاَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (البقرہ: 210) تو کہتے ہیں کہ عزیز وہ ہے جو اپنے امر پر غالب ہے۔ کوئی چیز اسے تم سے نافرمانوں سے انتقام لینے سے نہیں روکتی۔ لیکن وہ حکیم بھی ہے جو مجرموں کا مواخذہ کرتے ہوئے حکمت کے تقاضوں کو ترک نہیں کرتا۔

پھر دوسری آیت کے بارے میں ہی بیان کرتے ہیں کہ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتٰى۔ قَالَ اَوْلَمْ تُؤْمِنْ۔ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ۔ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يٰتَيْنِكَ سَعِيًّا۔ وَاَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (البقرہ: 261) کہ اور کیا تو نے اس پر بھی غور کیا جب ابراہیمؑ نے کہا کہ اے میرے رب! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟ اس نے کہا کیا تو ایمان نہیں لاچکا؟ اس نے کہا کیوں نہیں؟ مگر اس لئے پوچھا ہے کہ میرا دل مطمئن ہو جائے، اس نے کہا تو چار پرندے پکڑ لے اور انہیں اپنے ساتھ مانوس کر لے۔ پھر ان میں سے ایک ایک کو پہاڑ پر چھوڑ دے پھر انہیں بلا۔ وہ جلدی کرتے ہوئے تیری طرف چلے آئیں گے اور جان لے لے کہ اللہ غلبہ والا اور بہت حکمت والا ہے۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں یہاں صرف حَکِیْم کے معنی استعمال کئے ہیں کہ اپنے تمام افعال میں حکمت بالغہ سے کام لینے والا، اس کے افعال کی بنا روزمرہ کے اسباب پر نہیں کیونکہ وہ خارق عادت نشان دکھانے سے عاجز نہیں بلکہ اس کے جملہ افعال اپنے اندر بے شمار حکمتیں اور مصلحتیں لئے ہوئے ہیں۔ نشانات اللہ تعالیٰ دکھا سکتا

ہے اور ایسے ایسے عجیب نشان دکھاتا ہے کہ بندہ وہاں تک پہنچ نہیں سکتا۔

اس آیت میں حضرت ابراہیم عليه السلام نے اللہ تعالیٰ سے نشان مانگا ہے جس کا ذکر ہے اور اس پر خدا تعالیٰ کا جواب یہ ہے جو ابھی پڑھا گیا۔ مفسرین اس کو ظاہری ایمان پر محمول کرتے ہیں اور بعض کی عجیب عجیب اس بارے میں تفسیریں ہیں۔

حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اس کی تفسیر کی ہے۔ میں اس کا مختصر ذکر کرتا ہوں جو اس کی حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں حضرت ابراہیم عليه السلام نے یہ دعا کی کہ احیاء موتی کا کام جو میرے سپرد ہے وہ کس طرح ہوگا؟ مردوں کو یعنی روحانی مردوں کو زندہ کرنے کا کام جو میرے سپرد ہے وہ کس طرح ہوگا؟ تو اللہ! تو ہی مجھے دکھا کہ قوم میں زندگی کس طرح پیدا ہوگی جبکہ میں بوڑھا ہوں اور کام بھی بے انتہا اہم ہے۔ یہ کس طرح پورا ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ چار پرندے لے کر ان کو سدھا، انہیں پہاڑوں پر رکھ دے وہ تیری طرف آئیں گے۔ تو اس کی تشریح میں فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنی اولاد کی تربیت کر۔ وہ تیری آواز پر لبیک کہتے ہوئے احیاء دین کے کام کی تکمیل کریں گے اور یہ روحانی پرندے حضرت اسماعیل عليه السلام، حضرت اسحاق عليه السلام، حضرت یعقوب عليه السلام اور حضرت یوسف عليه السلام ہیں، ان میں سے دو کی حضرت ابراہیم عليه السلام نے براہ راست تربیت کی اور دو کی بالواسطہ۔ پہاڑ پر رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے رفیع الشان، رفیع الدرجات ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اور چار پرندوں کو علیحدہ علیحدہ پہاڑ پر رکھنے سے یہ بھی مراد ہے کہ احیاء دین چار مختلف وقتوں میں ہوگا۔ ایک تو پہلے زمانے میں ہوا۔ پھر کیونکہ حضرت ابراہیم عليه السلام نے دعا بھی کی تھی کہ میں اپنی اولاد کے بارے میں بھی یہ نشان دیکھنا چاہتا ہوں یعنی بعد میں آنے والوں میں بھی یہ نشان ظاہر ہو کہ وہ احیاء موتی کرنے والے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری قوم چار مرتبہ مُردہ ہوگی اور ہم چار مرتبہ زندہ کریں گے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں پہلے یہ آواز بلند ہوئی جو حضرت ابراہیم عليه السلام کی آواز تھی۔ پھر حضرت عیسیٰ عليه السلام کے ذریعہ سے آواز بلند ہوئی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے آواز بلند ہوئی اور اب اس زمانہ میں چوتھی مرتبہ وہ آواز بلند ہوئی جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ سے بلند ہوئی۔

پس پہلا پرندہ موسوی امت تھی، دوسرا پرندہ عیسوی امت تھی اور تیسرا پرندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت تھی جن پر آپ کا جلالی ظہور ہوا اور چوتھا پرندہ جمالی ظہور کی مظہر جماعت احمدیہ ہے جن کے ذریعہ سے حضرت ابراہیم عليه السلام کے قلب کو راحت پہنچی اور نزدیک اور دُور کی اولاد کے زندہ ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ نے نظارے

دکھائے اور یہی خدا تعالیٰ کے عَزِيزُ اور حَكِيمٌ ہونے کا اظہار ہے اور یہ زندہ ہونا اب ہم پر بحیثیت احمدی ایک ذمہ داری بھی ڈالتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی پیشگوئی کے مطابق جو احیاء موتی اس زمانے میں ہونا تھا اس نے دائمی رہنا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی پُر حکمت تعلیم جو تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے اس سے چمٹے رہنا ضروری ہے تاکہ ہر فرد جماعت احیاء موتی کا نظارہ دکھانے والا بھی ہو اور دیکھنے والا بھی ہو۔ پس جب تک ہم تقویٰ پر قائم رہیں گے یہ نظارے انشاء اللہ دیکھتے رہیں گے۔

پھر حضرت ابن عباسؓ ایک مثال میں بیان کرتے ہیں کہ اَفْغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَعِيْ حَكْمًا۔ سورۃ الانعام کی 115 ویں آیت ہے۔ کہتے ہیں کہ حَكْمٌ اپنے معنی کے اعتبار سے حاکم سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے۔ حَكْمٌ اس حاکم کو کہتے ہیں جس کا کوئی ہمسرنہ ہو اور جسے اس کام کے لئے بطور خاص مختص کیا گیا ہو۔ اسی وجہ سے حَكْمٌ کی صفت صرف عادل کے لئے آتی ہے یا اس کے لئے استعمال ہوتی ہے جسے بار بار فیصلے کرنے کا موقع ملتا ہے۔

یہ جو آیت ہے اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ جو میرا حَكْمٌ ہے اس کے علاوہ کسی اور کو میں کیوں حَكْمٌ بناؤں۔ کسی اور کے پاس فیصلے کروانے کے لئے کیوں جاؤں؟ یا فیصلے کرانے کے لئے اللہ کے علاوہ دوسرے انسانوں کو کیوں بلاؤں؟ جبکہ خدا تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے اور وہ سب سے زیادہ بہترین فیصلہ کرنے والوں میں سے ہے۔ مخالفین دین آج جتنا بھی شور مچاتے رہیں کہ ہم فیصلہ کرتے ہیں، ایک مومن کا یہی جواب ہونا چاہئے اور ہوتا بھی ہے کہ اَفْغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَعِيْ حَكْمًا (الانعام: 115) یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ میں کوئی اور فیصلے کرنے والا ڈھونڈوں؟ مجھے تو کسی دوسرے کی حاجت نہیں ہے۔ میں تو اس یقین سے پُر ہوں اور میں اس یقین پر قائم ہوں کہ اللہ جو حَكِيمٌ اور حَكْمٌ ہے اس نے ایک ایسی پُر حکمت تعلیم کی طرف میری رہنمائی کر دی ہے اور ایسے فیصلہ کن نشان دکھادیئے ہیں کہ مجھے ضرورت نہیں کسی اور کے پاس جانے کی۔ جس مرضی نام نہاد عالم کی یا بڑے آدمی کی تحریریں لے آؤ جو میرے خلاف ہیں اگر خدا تعالیٰ کا فیصلہ میرے ساتھ ہے تو کوئی پرواہ نہیں کہ تم کتنا شور مچاتے ہو۔ تمہارے دنیاوی منصب تو لوگوں کی حمایت کے مرہون منت ہیں اور جب اسمبلیاں اور عدالتیں اور حکومتیں فیصلہ کرتی ہیں تو شور مچانے والوں کی اور بعض اوقات شریکوں کی طاقتوں کو دیکھتی ہیں لیکن میرا خدا جو غالب بھی اور حکیم بھی ہے جب فیصلہ دیتا ہے تو وہ فیصلہ ہے جو ہماری دنیا و آخرت سنوارنے والا فیصلہ ہے۔ پس ایسے خدا کے علاوہ مجھے کسی منصف کی ضرورت نہیں ہے۔ آج ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ماننے والے ہیں۔ آج ہم قرآنی پیشگوئیوں کو پورا ہوتا دیکھ کر اس یقین پر قائم ہیں کہ حضرت

مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام وہی مسیح و مہدی ہیں جن کے آنے کی پیشگوئی تھی اور خدا کی کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فوت شدہ قرار دے کر آنے والے مسیح کی آمد کا اعلان کر رہی ہے۔ خدا کی کتاب آنحضرت ﷺ کی امت میں سے ہی مسیح و مہدی کی آمد کا اعلان کر رہی ہے۔ تو پھر عدالتیں یا حکومتیں یا اسمبلیاں کیا حیثیت رکھتی ہیں کہ ہم ان کے فیصلوں کو تسلیم کریں اور خدا تعالیٰ کے فیصلے کو جو أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ہے رد کر دیں۔ پس اس فیصلے کو جو عزیز و حکیم خدا نے کیا ہے رد کرنے والے رد کئے جائیں گے۔ ہمیں زور لگانے والے، یا ہمیں کہنے والے کہ اس کو رد کر دو، وہ خود رد کئے جائیں گے اور ہم انشاء اللہ ہمیشہ کی طرح کامیابی کی منزلیں طے کرتے چلے جائیں گے۔ اس لئے چاہے وہ پاکستان کی اسمبلی ہو یا کسی اور ملک کی اسمبلی ہو ہمیں ان کے فیصلوں کی ذرہ بھر بھی پرواہ نہیں۔ کیونکہ ان کے فیصلے تقویٰ سے عاری اور جہالت کے پلندے ہوتے ہیں۔ آج اگر کسی حاکم نے فیصلہ کرنا ہے اور ہمیشہ سے جو حاکم فیصلہ کرتا آیا ہے وہ خدا تعالیٰ کی ذات ہے اور وہی سب سے بڑا حاکم ہے، منصف ہے، بیخ ہے جس نے فیصلے کئے ہیں اور ان کے فیصلوں کے مطابق ہم اسی دین پر قائم ہیں جو محمد مصطفیٰ ﷺ لے کر آئے تھے اور انشاء اللہ مرتے دم تک قائم رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو تقویٰ پر چلتے ہوئے اس حکیم خدا کی صفت حکیم کو بھی اپنانے کی توفیق دے اور ہمیشہ حکمت سے چلنے والے اور ہمیشہ خدا تعالیٰ کے احکامات پر حقیقی طور پر تقویٰ سے چلتے ہوئے عمل کرنے والے ہوں۔

ضمناً میں یہ بھی بتا دوں کہ آج کل ایم ٹی اے پر ایک پروگرام مولانا دوست محمد صاحب شاہد دے رہے ہیں جو 1974ء کی اسمبلی کے بارے میں حالات پر ہے۔ وہاں ماشاء اللہ بڑی حقیقت بیانی ہو رہی ہے۔ خوب کھول کھول کر ان کے کچے چٹھے بیان ہو رہے ہیں اور مخالفین کے پاس ان کا جواب نہ اُس وقت تھا جب حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ اسمبلی میں پیش ہوئے تھے، نہ آج ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ احمدیت ہی ہے جس نے ہمیشہ صحیح رستے پر چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کا اظہار اپنے ہر ماننے والے پر بھی کرنا ہے اور دنیا میں بھی پھیلا نا ہے۔